عہدِ سلطنت کے فقہی لٹریچر کا تنقیدی جائزہ

جناب ظفرالاسلام صاحب ، شعبۂ تاریخ ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

فقہی مسائل سے سلاطین کی دلچسپی خواہ نظم ونسق میں شرعی قوانین سے واقفیت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو یا معاصر علماء و فقہاء کے اثرات سے۔ یہ بہرحال فقہی علوم کی نشر واشاعت کا ایک اہم ذریعہ بنی۔ سلاطین کی علم دوستی اور معارف پروری سے فیضیاب ہوکر علماء نے تالیفی وتصنیفی کارنامے انجام دیے اور اپنے ذہنی رجحانات کی رعایت سے اور مذہبی علوم وفنون میں فقہ کی مقبولیت کے پیش نظر اسی میدان میں خاص طور سے اپنی صلاحیتیں اجاگر کیں، دوسری جانب بعض سلاطین نے خود فقہی علوم کی ترویج وترقی میں براہ راست حصہ لیا اور اپنے زیر نگرانی فقہی کتابیں مرتب کرائیں جیسا کہ آنے والی تفصیلات سے واضح ہوگا۔ فقہ کی عام مقبولیت اور فقہی علوم کی نشر واشاعت میں سلاطین وعلماء دونوں کی دلچسپی کے باعث عہد سلطنت میں فقہی تالیفات کا ایک ایسا معتدبہ سرمایہ اکٹھا ہوا جو آج بھی ہمارے لئے قابل قدر اور لائق توجہ ہے۔

ہندوستان میں فقہ کی کتابیں لکھنے کا سلسلہ فتوحات کے دور سے ہی شروع

تھا جبکہ ابھی یہاں مسلم حکومت کا باقاعدہ قیام بھی عمل میں نہیں آیا تھا[1] لیکن فقہی علوم کی نشر و اشاعت کے اعتبار سے تغلق سلاطین بالخصوص اول تین کا عہد حکومت (۱۳۲۰ء - ۱۳۸۸ء) سب سے زیادہ ممتاز و نمایاں ہے اسی لئے چودھویں صدی عیسوی کے ہندوستان کو فقہ کے عروج کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں فقہ اور فقہی لٹریچر کے میدان میں جو سرگرمی دکھائی دیتی ہے اس کی نظیر کسی دوسرے عہد میں ملنی مشکل ہے۔ یہ وہ دور ہے جب دربار سے لے کر علماء کی ذاتی مجلسوں تک فقہ کا چرچا سنائی دیتا ہے اور علماء و فضلاء سے قطع نظر سلاطین و امراء کے یہاں بھی اس کی مقبولیت کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ سلطان غیاث الدین تغلق اور فیروز شاہ تغلق اپنے مذہبی رجحانات اور دینی میلانات کے لئے معروف ہیں۔ انھیں چھوڑ دیجئے محمد بن تغلق جو عام طور پر اپنی طبیعت کے تضاد، روایت سے انحراف، عقلیت پسندی اور علماء سے اختلاف کے لئے مشہور ہے، فقہ میں کافی شغف رکھتا تھا۔ اس کی بابت یہ شہادت ملتی ہے کہ ہدایہ اسے زبانی یاد تھی[2] اور یہ کہ روزانہ اس کے دسترخوان پر تقریباً دو سو فقہاء موجود رہتے تھے[3] سفر و حضر دونوں حالت میں علماء سے مختلف مسائل پر اس کے تبادلۂ خیال

---

[1] اس دور میں مرتب کی جانے والی فقہ کی کتابوں میں "مجموع سلطانی" بھی شامل ہے، اسے بالعموم محمود غزنوی کے عہد سے منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن بعض جدید اسکالرس نے اس خیال سے اختلاف ظاہر کیا ہے اور اسے بعد کے دور کی تالیف بتایا ہے، ملاحظہ کیجئے ایوانو، ڈسکرپٹیو کیٹلاگ آف پرشین مینوسکرپٹ ان دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ ۱۹۲۴ء، ص ۵۰۸ (ع ۱۰۳۲)

[2] مسالک الابصار، ص ۳۷۔

[3] صبح الاعشیٰ، ص ۹۶-۹۷۔

کرتا ہے[1] اور ساتھ ہی تاریخی ماخذ سے یہ بھی ثابت ہے کہ اس نے دربار میں چار مفتیوں کو مامور کیا تھا اور جرائم کے مقدمات کو فیصل کرتے وقت بالخصوص کسی کو سزائے موت دینے سے قبل ان کی رائے ضرور معلوم کرتا تھا[2]۔ مذہبی علوم و فنون خاص کر فقہ سے اس کی دلچسپی اس امر سے بخوبی واضح ہوتی ہے کہ اس نے سمرقند کے مشہور عالم برہان الدین ساغرجی اور شیراز کے مایۂ ناز فقیہ قاضی مجد الدین کو ہندستان بلانے کے لئے اپنے مخصوص سفرار روانہ کیے تھے اور ان علمار کے اخراجات سفر کے لیے خطیر رقمیں بھی ارسال کیں[3]۔ مزید براں اس نے دوسرے ممالک سے فقہ کی نادر کتابیں منگوانے کے علاوہ اپنے عہد کے مشہور عالم معین الدین عمرانی کے ذریعہ قاضی عضد سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ "مواقف" نامی اپنی تالیف اس کے نام معنون کر دیں[4]۔ سلطان نے فقہی علوم کی اشاعت کی جانب بھی توجہ مبذول کی، اس کے عہد میں مدارس کے نصاب میں فقہ کی تعلیم پر خاص زور دیا گیا جیسا کہ بعض عربی مورخین کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے[5]۔ معاصر

---

[1] صبح الاعشیٰ، ص ۹۵　　[2] برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۹۷۔

[3] رحلہ ابن بطوطہ، ص ۴۴۳، مسالک الابصار، ص ۴۲-۴۳، برہان الدین کو لانے کے لئے شیخ ابوبکر بن خلال چالیس ہزار تنکوں کے ساتھ روانہ کیے گئے تھے اور قاضی مجد الدین کی خدمت میں شیخ زادہ دمشقی کو مع دس ہزار تنکہ بھیجا گیا تھا۔

[4] اخبار الاخیار، ص ۱۴۵ و نیز دیکھئے رحلہ، محولہ بالا، ص ۴۴۳، حدائق الحنفیہ، ص ۳۰۴-۳۰۵، رحمان علی خاں، تذکرہ علمار ہند، نولکشور، ۱۹۱۴ء، ص ۲۲۸-۲۲۹۔

[5] بقول شہاب الدین العمری (مسالک الابصار، ص ۲۴) اور القلقشندی (صبح الاعشیٰ، ص ۶۹) محمد تغلق کے عہد میں دہلی میں ہزار مدرسے تھے اور ایک کے علاوہ باقی تمام میں حنفی مسلک کے مطابق فقہ کی تعلیم دی جاتی تھی، مدارس پر اس تبصرہ میں خصوصیت سے فقہ کا ذکر قابل غور ہے۔

[illegible] سے یہ بھی ثابت ہے کہ اس نے مکاتب و مدارس میں درس و تدریس کے لیے [illegible] فقہاء مقرر کیے تھے جن کے اخراجات حکومت خود برداشت کرتی تھی[1]

محمد بن تغلق کے عہد میں دینی و علمی حلقوں میں فقہ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ علماء کے ساتھ صوفیاء کی اس فن سے دلچسپیاں بھی کچھ کم نہ تھیں۔ محمد بن تغلق کے معاصر اور مشہور چشتی بزرگ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی فقہ میں اپنی مہارت کے سبب "ابو حنیفہ ثانی" کے لقب سے معروف تھے[2] شیخ فخر الدین زرادی[3] اور قاضی محی الدین کاشانی جو شیخ نظام الدین اولیاء کے خاص مریدین میں شامل تھے فقہ پر عبور رکھتے تھے[4] اسی دور کے ایک دوسرے عالم اور بزرگ حسام الدین ملتانی کی بابت بیان کیا جاتا ہے کہ انھیں ہدایہ کی دونوں جلدیں زبانی یاد تھیں[5] بعض صوفیاء نے فقہ کے موضوعات پر اپنی تحریری کاوشیں بھی پیش کیں۔ شیخ نصیر الدین کے خلیفہ شیخ یوسف "تحفۃ النصائح" نامی ایک منظوم کتاب کے مصنف تھے جس میں عبادات اور فرائض و سنن کی تفصیلات کے علاوہ شریعت کے اور بہت سے احکام مذکور ہیں[6] شیخ نصیر الدین کی صحبت سے

---

[1] مسالک الابصار، ص ۳۹

[2] خیر المجالس (ملفوظات شیخ نصیر الدین چراغ دہلی) مرتبہ حمید قلندر، تصحیح پروفیسر خلیق احمد نظامی علی گڑھ، ص ۱۲/ ۳۴۔

[3] سید محمد بن مبارک کرمانی، سیر الاولیاء، لاہور ۱۹۶۸ء، ص ۲۷۲-۲۷۶۔

[4] اخبار الاخیار، ص ۹۸، فقیر محمد جہلمی، حدائق الحنفیہ، نولکشور، لکھنؤ ۱۹۰۶ء، ص ۲۷۶

سیر الاولیاء ص ۳۰۴-۳۰۵۔

[5] سیر الاولیاء، ص ۲۵۶۔

[6] تذکرہ علماء ہند، محولہ بالا، ص ۲۵۶، حدائق الحنفیہ، ص ۲۹۴، فہرست مخطوطات شیرانی، لاہور، ۱۹۶۹ء جلد دوم، ص ۲۷۵۔

فیض یافتہ ایک دوسرے عالم رکن الدین نے فقہی مسائل سے متعلق ایک طویل مثنوی تقریباً پچیس ہزار اشعار پر مشتمل تحریر کی جو "طرفۃ الفقہاء" کے نام سے معروف ہوئی[۱] مزید براں سہروردی سلسلہ کے ایک صوفی شیخ فضل اللہ بن محمد بن نے (جو ماجو کے لقب سے مشہور تھے) "فتاوای صوفیہ" مرتب کیا گرچہ متعدد مسائل میں فقہاء کے عام مسلک سے اختلاف کی وجہ سے اسے تنقید کا نشانہ بننا پڑا[۲]

فقہ سے دلچسپی اور فقہی علوم کی نشر و اشاعت کا جو ماحول محمد بن تغلق کے دور میں گرم ہوا تھا وہ ان کے جانشین فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں نہ صرف باقی رہا بلکہ مزید پروان چڑھا[۳] اس میں سلطان کے ذاتی رجحانات کو خاص دخل تھا۔ فیروز شاہ ایک مذہب پسند سلطان تھا اسے دینی امور میں دلچسپی اور مذہبی امور سے خاص رغبت تھی اور سیرت فیروز شاہی کے مطابق اسے فقہ پر "عبور تام" حاصل تھا[۴] سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ نظم و نسق کے مختلف شعبوں میں احکام شرعی کے نفاذ کا نہ صرف خواہشمند تھا بلکہ اس کے لیے اس نے سنجیدہ کوشش بھی کی جس کا کھلے لفظوں میں اعتراف معاصر

۱۔ حدائق الحنفیہ، ص ۲۸۸، فہرست مخطوطات شیرانی، جلد دوم، ص ۲۹۳-۲۹۴۔

۲۔ حدائق الحنفیہ، ص ۳۰۵-۳۰۶۔

۳۔ عہد فیروز شاہی میں فقہ کے عروج پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں "فقہ اور تصوف کے درمیان جس کشمکش کا پہلا اظہار غیاث الدین تغلق کے عہد میں ہوا تھا وہ فقہ کی صورت میں اب ختم ہوتا نظر آرہا تھا" (سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، محولہ بالا، ص ۳۸۹۔

۴۔ سیرت فیروز شاہی، قلمی نسخہ، مولانا آزاد لائبریری، یونیورسٹی کلکشن، فارسیہ اخبار، ۱۱۱، ص ۳۹۰-۳۹۱۔

مورخین کے یہاں ملتا ہے[1]۔ اسی کوشش کا ایک حصہ فقہی علوم کی نشر و اشاعت تھا۔ سلطان نے اس کی ترویج میں غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے علماء بالخصوص ماہرین فقہ کی حوصلہ افزائی میں نہایت فیاضی و فراخ دلی سے کام لیا[2]۔ مذہبی علوم و فنون کی توسیع و ترقی کے لیے اس نے متعدد مدارس قائم کیے جن کے جملہ اخراجات کی تکمیل شاہی خزانے سے ہوتی تھی[3]۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں عہد فیروز شاہی کا امتیاز یہ ہے کہ فقہ کی قدیم کتابوں پر شروح و حواشی اور مختصر فقہی رسائل کے علاوہ فقہ کی چند مبسوط کتابوں کی تالیف اور فتاویٰ کے مجموعوں کی ترتیب بھی عمل میں آئی۔ سلطان نے خود اپنی نگرانی میں فتاویٰ کا ایک اہم مجموعہ مرتب کرایا جو فتاوای فیروز شاہی یا فقہ فیروز شاہی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس مجموعہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ عہد وسطیٰ کے دیگر فتاویٰ کے برخلاف باقاعدہ استفتاء و فتویٰ کے پیرایہ میں ہے اور اس کا بیشتر حصہ بالخصوص سوالات و جوابات فارسی میں ہے۔ یہاں یہ ذکر اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ تعلق سلاطین کے زمانہ میں امراء یا اعیانِ سلطنت بھی فقہ میں دلچسپی رکھتے تھے جیسا کہ شہاب الدین العمری اور برنی دونوں کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے[4]۔ فیروز شاہ کے عہد میں اس کا عملی ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے۔ ان کے علم دوست وزیر تاتار خاں نے اپنے زیر اہتمام

---

[1] برنی، ص ۵۴۸-۵۵۲، ۵۶۱-۵۶۲، عفیف ص ۹۸، ۹۹، فتوحات فیروز شاہی، ص ۳، انشاء ماہرو، ص ۱۶۔

[2] برنی، ص ۵۵۹، عفیف، ص ۱۷۹۔

[3] سیرت فیروز شاہی، ص ۱۴۷، فتوحات فیروز شاہی، ص ۱۱-۱۲، طبقات اکبری، محولہ بالا، ص ۱۲۱۔

[4] مسالک الابصار، ص ۲۷، برنی، ص ۵۷۹۔

"فتاویٰ تاتارخانی" کے نام سے ایک ایسا مجموعہ تیار کرایا جو آج بھی قابل یادگار اور لائق استفادہ ہے۔ ان تفصیلات کی روشنی میں یہ کہنا مبالغہ آرائی نہ ہوگا کہ پورے عہد سلطنت میں فیروز شاہ کا دور فقہی کارناموں کے لئے سب سے زیادہ اہمیت کا حامل اور ممتاز ہے۔

فیروز شاہ کے بعد تقریباً ربع صدی تک دہلی سلطنت انتشار و افتراق کا شکار رہی علمی و تمدنی ترقی بھی اس سے متاثر ہوئی۔ سیاسی عدم استحکام کے اس عرصہ میں مذہبی علوم و فنون کے میدان میں کوئی ایسا کام انجام نہیں پایا جسے ذکر کیا جا سکے۔ اس کے بعد سید و لودی سلاطین کے عہد میں جسے دہلی سلطنت کا آخری حصہ کہا جا سکتا ہے علمی و فنی سرگرمیاں پھر شروع ہوئیں اور دیگر علوم کے ساتھ علم فقہ بھی ترقی کی راہ پر گامزن ہوا۔ لودی خاندان کے سلاطین میں سکندر لودی کے زمانہ میں اسطرح کی ترقیاں زیادہ نمایاں ہوئیں وہ علم کا دلدادہ اور علماء کا قدر داں تھا اور زیر بحث موضوع کے لحاظ سے سب سے اہم یہ کہ وہ فقہی مسائل سے دلچسپی رکھتا تھا اور اہم مسائل کی تحقیق کے لئے علماء کی مجلسیں بھی منعقد کراتا تھا اور ان کے بحث و مباحثہ سے مستفید ہونے کے لئے ان میں خود بھی شریک ہوتا تھا[۱] یہ علمی ماحول خاص کر علم فقہ سے تعلق بعد کے دور میں بھی برقرار رہا۔ اس کا ایک بدیہی ثبوت سور خاندان کے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے زمانہ میں "فتاوای ابراہیم شاہی" کی تالیف ہے جسے عہد سلطنت کی فقہی تالیفات میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

عہد سلطنت کے فقہی لٹریچر پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالنے سے چند اہم نتائج

[۱] واقعات مشتاقی، ص۹۴، تاریخ داؤدی، ص۴۰، تاریخ شاہی ص۴۶، زبدۃ التواریخ، ص۷۲۔

بنا مرتب ہوتے ہیں یہاں ان کی وضاحت افادیت سے خالی نہ ہوگی۔ اول یہ کہ فقہی مجموعے
اس وقت سب سے پسندیدہ طرز تالیف فتاویٰ کے مجموعے مرتب کیا تھا۔ اس عہد
کی اہم فقہی تالیفات بالخصوص وہ جن کی ترتیب وتکمیل سلاطین وامراء کی زیر نگرانی عمل
میں آئی یا ان کے نام منسوب ہیں۔ زیادہ تر فتاویٰ کے مجموعے ہیں مثلاً فتاوای غیاثی
فتاوای فیروز شاہی، فتاوای تاتارخانی، فتاوای ابراہیم شاہی وغیرہ۔ فتاویٰ کی صورت
میں فقہی مسائل کی تشریح وتوضیح یا احکام شرعی تبیین کا طریقہ عہد وسطیٰ میں ہندوستان سے
قبل دیگر مسلم ممالک میں بھی رائج رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی فقہی تالیف کے نام میں
لفظ "فتاویٰ" کی شمولیت سے یہ عمومی تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اس میں سوال وجواب یا
استفتاء وفتویٰ کے پیرایہ میں فقہی مسائل زیر بحث آئے ہوں گے اور ان میں معاصر علماء
کے خیالات کی بھی ترجمانی کی گئی ہوگی لیکن اس دور میں مرتب کئے گئے فتاویٰ کے مجموعوں
میں ایک دو کو چھوڑ کر باقی تمام متن کی صورت میں ملتے ہیں اور ان کا انداز بیان فقہ
کی متداول کتابوں جیسا ہے ان میں معاصر ماہرین فقہ کے بجائے فقہاء متقدمین کے
نتائج فکر کو زیادہ جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عہد سلطنت کے فتاویٰ میں مجھے صرف
فتاوای فیروز شاہی ایسا مل پایا ہے جو استفتاء وفتویٰ کے پیرایہ میں مرتب کیا گیا ہے اور
جس میں عصری مسائل کی عکاسی بھی ملتی ہے[1]۔ عہد وسطیٰ کے فتاویٰ میں اگر فقہ کے معروف
مسائل کی وضاحت کے ساتھ اس وقت کے سماج ومعاشرت کو درپیش مخصوص مسائل
پر علماء کے خیالات کو پیش کیا گیا ہوتا تو نہ صرف فقہی حیثیت سے ان تالیفات کی

---

[1] اس کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں راقم الحروف کا مضمون "فتاوای فیروز شاہی اور عصری مسائل" ماہنامہ برہان (دہلی)، جلد ۹۱، شمارہ ۱ و ۲ (جولائی واگست ۱۹۸۳ء)

اہمیت و افادیت میں اضافہ ہوتا بلکہ عہدِ وسطیٰ کی معاشرتی تاریخ کے لئے بھی ایک گراں قدر سرمایہ ثابت ہوتا۔

عہدِ سلطنت کی فقہی کتابوں کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ وہ زیادہ تر عربی میں ہیں حتیٰ کہ وہ کتابیں جو کسی سلطان یا امیر کے ایما پر مرتب کی گئی تھیں اور جن کا مقصد وسیع پیمانہ پر عوام سے لے کر اہلِ حکومت تک) اسلامی قوانین کی نشر و اشاعت تھا ان کی زبان بھی عموماً عربی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قاضی، مفتی، صدر، محتسب وغیرہ عربی زبان سے بہرور ہوتے تھے لیکن نظم و نسق کے دوسرے شعبوں سے جو لوگ منسلک تھے اور متوسط درجہ کے پڑھے لکھے لوگ عربی کی بہ نسبت فارسی سے زیادہ واقف ہوتے تھے اور یہ تو بہرحال مسلّم ہے کہ اس دور میں سرکاری سطح پر فارسی ہی کو مقبولیت حاصل تھی۔ ان سب کے باوجود فقہی موضوعات پر اظہارِ خیال کے لیے عربی کو ترجیح دینے کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ اول یہ کہ مذہبی علوم و فنون پر قلم اٹھانے والے (بالخصوص ابتدائی دور میں) زیادہ تر وہ علماء تھے جن کی اصل مشرقِ وسطیٰ سے تھی اور جن کی تعلیم و تربیت وہیں کے ماحول میں ہوئی تھی۔ دوسرے یہ کہ اگرچہ عام علمی و ادبی حلقوں میں فارسی زبان مروج تھی لیکن مذہبی علوم و فنون کی دنیا میں بہرحال عربی کو مقبولیت حاصل تھی اور دینی و مذہبی موضوعات پر اظہارِ خیال کے لیے علماء اسی کو پسند کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ممکن ہے بعض اہلِ قلم کے سامنے یہ پہلو بھی رہا ہو کہ عربی کتابیں نہ صرف ہندستان بلکہ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں بھی ان کے تعارف و شہرت کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ بہرحال اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ عہدِ وسطیٰ کے ہندستان میں اسلامی قوانین کی تشہیر اور فقہ اسلامی کی نشر و اشاعت کے لئے فارسی انتخاب زیادہ موثر و مفید ثابت ہوتا۔

اس دور کی فقہی تالیفات میں ایک اور امر مشترک یہ پایا جاتا ہے کہ وہ حنفی مسلک کی

ترجمانی پیش کرتی ہیں، گرچہ ان کتابوں میں اختلافی مسائل کے ضمن میں دیگر فقہی مذاہب کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی جاتی ہے لیکن آخر کار ترجیحی پہلو حنفی فقہار کی رائے کو ہی حاصل ہوتا ہے۔ مؤلفین یا مصنفین کی جانب سے حنفی مسلک کی ترجمانی اور اسے ترجیح دینے کی وجہ بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان ان ممالک میں شامل ہے جہاں فقہ حنفی کو رواج ملا اور اسے مقبولیت حاصل ہوئی[۱]۔ مسلم حکومت کے قیام کے بعد وسط ایشیار (غزنیں، غور، صنعان، کاشان، بلخ، تبریز، خوارزم وغیرہ) سے یہاں منتقل ہونے والے زیادہ تر حنفی تھے انھیں کے زیر اثر اس سرزمین میں فقہ حنفی کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے اپنی فقہی کتابوں میں اسی کو نمایاں کیا اور ان کے زیر تربیت جو ہندوستانی علمار وفضلار تیار ہوئے وہ بھی فقہ حنفی کے ترجمان بن کر نکلے۔ مزید براں وہ افراد جن کے ہاتھوں میں اس دور میں حکومت کی باگ ڈور رہی وہ بھی اصلاً ان علاقوں سے تعلق رکھتے تھے جو فقہ حنفی کے مراکز شمار کیے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب حنفی مسلک کے پیرو تھے اور معاصر علمار فقہ حنفی سے ان کے تعلق کو مضبوط کرنے میں مزید ممد ومعاون ثابت ہوئے۔ سلاطین نے نہ صرف یہ کہ سرکاری طور پر اسے مقبولیت عطا کی بلکہ اس کی اشاعت میں بھی حصہ لیا۔ یہاں اس جانب اشارہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فقہ حنفی کو مقبولیت ورواج دینے کے باوجود سلاطین دہلی اس کی اتباع میں متشدد نہیں تھے اور نہ ہی دوسرے مذاہب کے تئیں تنگ نظر

---

[۱] امیر خسرو، مثنوی دولرانی خضر خاں، محولہ بالا، ص ۴۶-۴۸، برنی تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۱، مسالک الابصار، ص ۲۴، صبح الاعشیٰ، ص ۶۹، نیز دیکھئے سید عبدالحئی، الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، اردو ترجمہ اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۷۰ء، ص ۱۵۲-۱۵۴۔

رائج ہو گئے تھے بلکہ اس ضمن میں ان کی وسیع المشربی کی نمایاں مثالیں ملتی ہیں۔ تاریخی شواہد سے ثابت ہے کہ ایسے علماء کو بھی شیخ الاسلام اور قاضی کے عہدہ پر مامور کیا گیا جو حنفی کے بجائے مالکی یا شافعی مسلک کے حامی و ترجمان تھے۔ علاء الدین خلجی کے عہد میں اودھ کے شیخ الاسلام مولانا فرید الدین مقرر کئے گئے تھے جو ایک شافعی عالم تھے[۱]۔ محمد بن تغلق نے مشہور سیاح ابن بطوطہ کو دار السلطنت کا قاضی بنایا تھا اور یہ بخوبی معلوم ہے کہ وہ مالکی تھے[۲]۔ مزید براں اس کے شواہد بھی موجود ہیں کہ سلاطین بعض اوقات درپیش مسائل میں فیصلہ لیتے وقت سیاسی مصلحت یا کسی اور وجہ سے حنفی فقہاء کے بجائے دیگر مذاہب کے فقہاء کی رائے کو اختیار کرتے تھے۔ مثال کے طور پر فیروز شاہ تغلق نے برہمنوں پر جزیہ عاید کرتے وقت اس کی یکساں مقدار (فی نفر دس تنکہ) مقرر کی تھی[۳] جبکہ حنفی مسلک کی رو سے ذمیوں کو امیر، متوسط اور غریب تین طبقوں میں تقسیم کرکے ان پر جزیہ کی مختلف مقدار متعین کی جاتی ہے۔ فیروز شاہ کا اقدام شافعی و مالکی فقہاء کے نقطۂ نظر کے مطابق تھا جو جزیہ کے نفاذ میں آمدنی کے اعتبار سے ذمیوں کی تقسیم ضروری نہیں تصور کرتے[۴]۔

عہد سلطنت کے فقہی لٹریچر کے جائزے سے یہ تلخ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اس کا بیشتر حصہ قدیم کتابوں کی شروح و حواشی پر مشتمل

---

[۱] سیر الاولیاء، محولہ بالا، ص ۲۸۵۔

[۲] رحلہ ابن بطوطہ، الجزء الثانی، ص ۸۱-۸۲۔

[۳] عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۸۴۔

[۴] الہدایہ، جلد ثانی (کتاب السیر، باب الجزیہ) ص ۵۷۰-۵۷۱، ابو الحسن علی الماوردی، الاحکام السلطانیہ، ۱۹۰۶ء، ص ۱۲۸۔

ہے، ایسی کتابیں بہت کم ملتی ہیں جن میں عصری مسائل سے بحث کی گئی ہو یا ان میں اس دور کے مخصوص سیاسی وسماجی مسائل پر فقہی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہو۔ تمدن اور معاشرت ومعیشت سے متعلق متعدد مسائل اس وقت وضاحت طلب تھے لیکن اس دور کی کتابوں میں ان کی جھلک خال خال ہی نظر آتی ہے۔ حتی کہ فتاویٰ کے مجموعے جو اصلاً اپنے عہد تالیف کے سماجی ومعاشی حالات کے عکاس ہوتے ہیں ان میں بھی اس نوع کے مسائل سے بحث شاذ ونادر ہی ملتی ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا عام طور پر اس کی توجیہ یہ پیش کی جاتی ہے کہ وہ تقلیدی دور تھا، علماء و فقہاء کے ذہنوں پر فقہی جمود طاری تھا اور اسی کے اثرات ان کی تالیفات وتخلیقات میں نمایاں ہوئے۔ لیکن تاریخی حقائق کی روشنی میں اس خیال سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ اگر اس دور میں کے سیاسی وسماجی امور پر سلاطین وعلماء کی باہمی مناظر کئی جائے بعض اہم واختلافی مسائل کی تحقیق کے لئے اس دور میں منعقد ہونے والی متعدد مجالس مذاکرہ (محضر) کو ملحوظ خاطر رکھا جائے اور علماء کے اپنے حلقوں میں بحث و مباحثہ کے موضوعات پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ عہد سلطنت میں فقہ اسلامی جمود وتعطل کا شکار تھا یا متحرک واجتہادی نظریات کا حامل تھا۔ معاصر مورخین کی تفصیلات سے یہ ثابت ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ سلاطین نظم ونسق کے نئے مسائل کی بابت بھی علماء سے استفسار کرتے تھے اور علماء ان کی شرعی حیثیت واضح کرتے تھے۔

لہ فقہ کی بعض مشہور کتابوں (ہدایہ، شرح وقایہ، قدوری، کنز الدقائق وغیرہ) پر ایک دو نہیں درجنوں کی تعداد میں شروح وحواشی ملتے ہیں۔ اسی طرح فقہ کی معروف کتابوں (مثلاً مسلم الثبوت، حسامی، تلویح وتوضیح) پر بھی کثرت سے شروح وحواشی اسی دور میں لکھے گئے)۔

ان میں سے بعض مسائل فقہی اعتبار سے کافی اہمیت کے حامل تھے مثلاً ہندوؤں کی شرعی حیثیت سیاسی جرائم کی سزائیں، بیت المال میں سلطان اور اس کے اہل و عیال کے حقوق، رشوت خور اور بددیانت افسران کے خلاف تادیبی کاروائی کی نوعیت، ہندوؤں کے بعض طبقوں پر (جو پہلے مستثنٰی تھے) جزیہ عاید کرنے کے مسائل وغیرہ۔ اسی طرح علماء کے مابین مختلف حالات میں جو فقہی مسائل زیر بحث آتے تھے ان کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً سرکاری طور پر اشیاء کی قیمت کی تحدید، ریاست کے معروف وسائل کے علاوہ نئے محاصل کا نفاذ، تجارتی وغیر تجارتی مقاصد کے لیے ہنڈی کا استعمال، آراضی ہند کی شرعی حیثیت، ہندوؤں سے تعلقات کی نوعیت وغیرہ۔ مذکورہ بالا اور اس نوع کے دیگر مسائل میں معاصر علماء کے غور و خوض اور ان کے نتائج فکر کی روشنی میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ عہد وسطی کے ہندوستان کی فقہ تقلیدی فقہ تھی اور عصری مسائل اور نئے حالات سے اس کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ بہرحال اس حقیقت کا اعتراف یہاں ضروری ہے کہ اس طرح کے مسائل پر بحث فقہی کتابوں کی بہ نسبت تاریخی تذکروں اور انشاء و خطوط کے مجموعوں میں زیادہ ملتی ہے۔ بظاہر یہ متضاد معلوم ہوتا ہے کہ وہ علماء جو نئے مسائل کے تئیں حساس تھے اور مجتہدانہ فکر کے حامل تھے، جب انھوں نے فقہ کے میدان میں قلم کو حرکت دی تو وہ اپنے خیالات کی جدت اور اجتہادی فکر کی جلوہ نمائی نہ کر سکے اور نہ ہی وہ اپنی تالیفات کو عصری مسائل کا عکاس بنا سکے۔ اس کے بجائے انھوں نے اپنی تحریری صلاحیتوں کو زیادہ تر قدیم کتابوں پر شروح و حواشی لکھنے یا ان کا خلاصہ بیان کرنے میں صرف کیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عہد وسطی کے علماء نے فقہی تصنیف و تالیف کے ضمن میں روایتی طرز کو ہی پسند کیا اور احکام شرعی کی وضاحت اور فقہ اسلامی کی اشاعت کے لیے بہتر یہی سمجھا کہ فقہ کی معروف کتابوں کی تشریح و توضیح کی جائے اور متون قدیمہ کا خلاصہ پیش کیا جائے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس

عہد کا بیشتر فقہی سرمایہ اسی قبیل کا تھا۔ اسی ماحول میں جہاں شروح و حواشی لکھنے کا عام رواج تھا اور قدیم طرز پر کتابیں لکھنا پسند کیا جاتا تھا۔ فقہ کی بعض ایسی اہم تالیفات ملتی ہیں جن میں معروف مسائل کی وضاحت کے ساتھ بہت سے عصری مسائل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس نوع کی تالیفات میں جیسا کہ اس سے قبل ذکر کیا گیا فتاوای فیروز شاہی کو اولین مقام حاصل ہے۔

مختصر یہ کہ عہد سلطنت کی فقہ کو جمود سے تعبیر کرنا ایک روایتی انداز بیان ہے جو اس عہد کے فقہی کارناموں اور علماء و فقہاء کے افکار و خیالات کے گہرے مطالعہ پر مبنی نہیں ہے۔ اس زمانہ کے فقہی لٹریچر کا تنقیدی جائزہ اور معاصر علماء کی علمی و فکری سرگرمیوں کا تجزیاتی مطالعہ عہد وسطیٰ کے فقہ کی نوعیت متعین کرنے اور اس وقت کے ہندوستان میں علماء کی فکری ارتقاء کو سمجھنے میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔ یہ مضمون پیش نظر مطالعہ کی پہلی کڑی ہے۔ اس کی آئندہ قسطوں میں انشاء اللہ پہلے ان کتابوں کا اجمالی تعارف پیش کیا جائے گا جو عہد سلطنت میں سلاطین و امراء کی ایماء پر یا انفرادی کوشش کے نتیجہ میں فقہ کے موضوع پر مرتب کی گئیں اور پھر کچھ اہم فقہی تالیفات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا خاص طور سے اس نقطۂ نظر سے کہ وہ کہاں تک اپنے دور کے سیاسی، سماجی و معاشی مسائل کی عکاس ہیں اور یہ کہ ان میں کس انداز میں ان مسائل سے بحث کی گئی ہے۔

وما التوفیق الا باللہ العلی العظیم۔